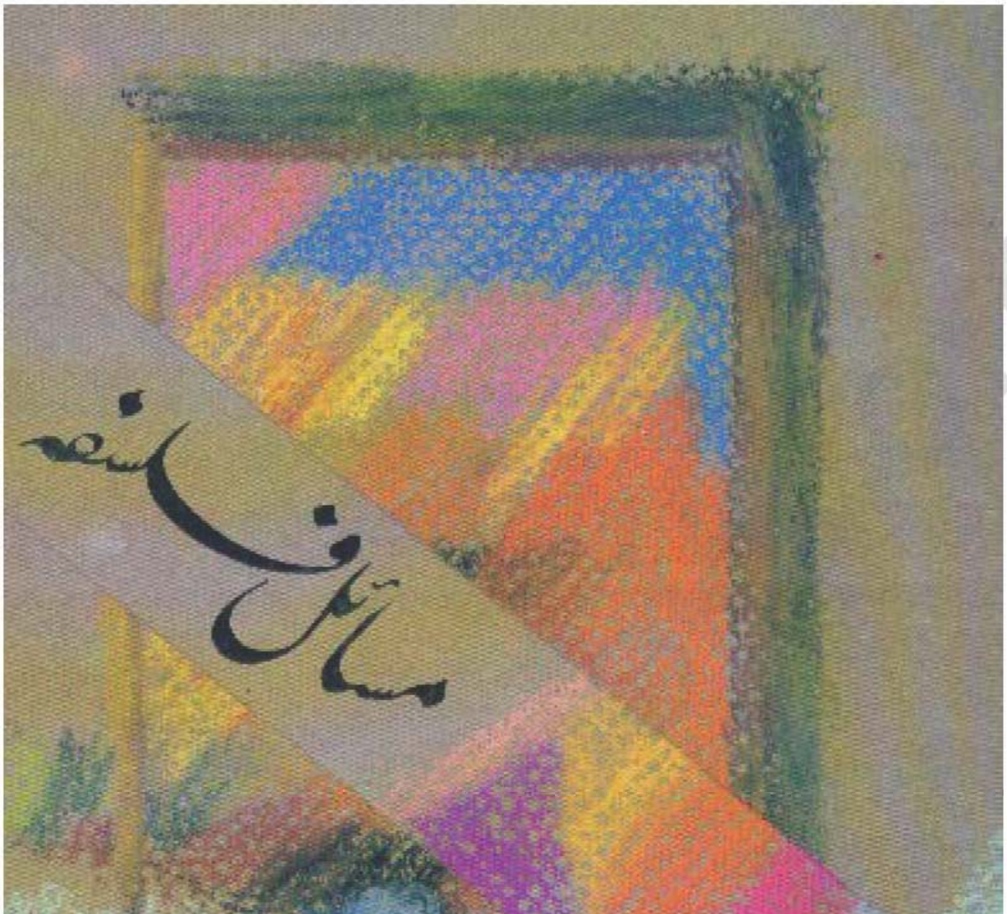

مسائل فلسفہ
برٹرینڈ رسل
ترجمہ: ڈاکٹر عبدالخالق

مسائل فلسفہ

مصنف: برٹرینڈ رسل

مترجم: ڈاکٹر عبدالخالق

مشعل

آر- بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور54600' پاکستان

MashalBooks.org

فہرست

تعارف	5
پیش لفظ	11
ظاہر اور حقیقت	13
مادے کا وجود	22
مادے کی نوعیت	31
تصوریت	39
علم بالوقوف اور علم بالبیان	46
استقراء کے بارے میں	57
عمومی اصولوں کے علم کے بارے میں	66
قبل تجربی علم کیونکر ممکن ہے	75
عالم کلیات	83
ہمارے علم کلیات کے بارے میں	92
وجدانی علم کے بارے میں	100
حق اور باطل	107
علم، غلطی اور احتمالی رائے	117
فلسفیانہ علم کی حدود	125
فلسفے کی اہمیت	134
اصطلاحات	143

MashalBooks.org

تعارف

فلسفے کا مطالعہ دیگر مضامین کی نسبت قدرے مشکل ہے۔ اس کے لیے جہاں ایک مخصوص نظام اصطلاحات اور فکری طریق ہائے کار سے واقفیت ضروری ہے، وہیں ذہن کو ایک مخصوص انداز میں تربیت دینے کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ غیر فلسفیانہ ذہن بالعموم محسوسات اور مادی اشاروں کے حوالے سے تفکر و تامل کرتا ہے لیکن اقلیم فلسفہ کی سرحدیں جہاں سے شروع ہوتی ہیں وہاں سے بتدریج محسوسات کی دنیا پیچھے رہتی جاتی ہے۔ جوں جوں ہم فلسفے کے سفر میں آگے بڑھتے جاتے ہیں تفکر و تامل کی تجرید بڑھتی چلی جاتی ہے اور ذہن جزئی حقائق کی بجائے عمومی نتائج اور کلیات کا عادی بنتا جاتا ہے۔ ذہن کی ایسی تربیت کے لیے ضروری ہے کہ ان مسائل کو بتدریج سمجھا جائے جن سے فلسفہ نبرد آزما ہوتا ہے۔

برٹرینڈ رسل کی کتاب Problems of Philosophy جس کا ترجمہ ''مسائل فلسفہ'' کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے دراصل تفہیم فلسفہ اور ذہن کی ایسی تربیت کی خاطر ہی لکھی گئی تھی۔

یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں ہماری جانی پہچانی دنیا ہے۔ ہر صبح وہی سورج طلوع ہوتا ہے جو لاکھوں سال سے طلوع ہوتا آیا ہے۔ سورج جس طرح طلوع ہوتا ہے اسی طرح غروب بھی ہو جاتا ہے۔ چاند کی چاندنی اور تاروں بھرے آسمان سے بھی ہم بخوبی شناسا ہیں۔ موسموں کا الٹ پھیر، آندھیاں، طوفان، بادل، پہاڑ، سمندر غرض سب مظاہر فطرت ہمارے دیکھے بھالے ہیں اور ان سے ہم اجنبیت محسوس نہیں کرتے۔ لیکن کبھی کبھی ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ دنیا اور مظاہر فطرت درحقیقت وہ نہیں ہے جو ہمیں نظر آتے ہیں۔ صحرا میں سفر کرتے ہوئے دور ہمیں پانی موجیں مارتا نظر آتا ہے لیکن قریب جانے پر ہمیں

پتہ چلتا ہے کہ ہم فریب نظر کا شکار ہو گئے تھے۔ درخت کا سایہ ہمیں ساکن لگتا ہے لیکن جب وہ اپنی سمت بدل کر مشرق سے مغرب کی طرف جاتا ہے اور جب وہ گھٹتا بڑھتا ہے تو ہمیں اپنے ادراک کی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک چھوٹا سا سکہ ایک ستارے کو ڈھانپ لیتا ہے لیکن ہماری عقل ہمیں بتاتی ہے کہ یہ ستارا ہماری زمین سے بھی کئی گنا بڑا ہے۔ پانی میں چھڑی ڈالیے تو یہ آنکھ کو ٹیڑھی نظر آئے گی باہر نکال کر دیکھئے تو سیدھی ہو گی۔ سورج ہمیں حرکت کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن یہ درحقیقت ساکن ہے۔ زمین کی سطح چپٹی لگتی ہے لیکن اصل میں یہ مدور ہے- چاند کی چاندنی جو کہ آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتی ہے، چاند سے خارج ہوتی محسوس ہوتی ہے حالانکہ چاند خود بے نور ہے، اس کی روشنی تو سورج کی دین ہے۔ جس تاروں بھرے آسمان کے نظارے سے شاعر کا تخیل سحر زدہ ہو جاتا ہے وہ ایک ماہر فلکیات کے لیے یکسر مختلف مفہوم رکھتا ہے۔

جس طرح دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے یا سانپ کا ڈسا رسی سے بھی ڈرتا ہے اسی طرح ہم بھی مجبور ہو جاتے ہیں کہ مظاہر اور حقیقت کے مابین تخصیص وتمیز کریں۔ ظاہریت اور اصلیت کی یہی تخصیص وتمیز فلسفیانہ تفکر کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ تفریق و تمیز ایک عامی اور فلسفی دونوں کے لیے پریشان کن ہے۔ لیکن ایک عام آدمی اپنی عملی ضرورتوں کے تحت اس تفریق وتمیز سے سمجھوتہ کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک فلسفی کے لیے یہ ایک چیلنج کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ تلاش حقیقت کے طول طویل سفر پر نکل کھڑا ہوتا ہے- بقول رسل ''ایک عملی رجحان رکھنے والا آدمی اور ایک فلسفی یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان کی (مظاہر کی) اصل کیا ہے۔ لیکن ایک فلسفی کی خواہش ایک عملی آدمی کی خواہش سے زیادہ شدید ہوتی ہے اور اس سوال کا جواب دینے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ ان سے زیادہ مضطرب بھی ہوتا ہے۔''

انسان کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات میں اتنا تنوع اور تعدد پایا جاتا ہے کہ اس کا احاطہ کرنا ناممکن لگتا ہے۔ پانی مٹی سے مختلف ہے، ہوا آگ سے مختلف ہے، لکڑی، لوہے سے مختلف ہے وغیرہ۔ لیکن جیسے جیسے انسان کا علم بڑھتا گیا وہ ایک متجانس مادے (Homogenious Matter) کا تصور قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا جو کائنات میں ہر طرف پھیلا ہوا ہے اور متعدد ومختلف مظاہر دراصل اسی ایک مادے کے مختلف اور متنوع پہلو

MashalBooks.org

ہیں۔لیکن اس بنیادی اصول یعنی مادے کی تشریحات بھی علمی ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں۔کسی نے مادے کی چار اقسام (خاک و باد و آب و آتش) کا ذکر کیا،کسی نے مادے کو لاتعداد اور غیر تقسیم پذیر جواہر قرار دیا،کسی نے اسے توانائی یا قوت کا نام دیا اور کسی نے سرسے سے اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔اس طرح نت نئے علمی اکتشافات سے ہماری جانی پہچانی دنیا اجنبی بنتی گئی۔

خارج کائنات کی نوعیت کے تعین کے ساتھ ساتھ جو دوسرا بڑا مسئلہ پیدا ہوا وہ ذہن اور علم کے بارے میں تھا۔ذہن مادے سے یکسر مختلف نوعیت رکھتا ہے۔مادی دنیا میں اگر میکانیت اور جبر کے قوانین کارفرما ہیں تو ذہن کی دنیا میں قوت تخلیق کی آزاد فعالیت پائی جاتی ہے۔مادی اشیاء جگہ گھیرتی ہیں لیکن افکار و خیالات غیر مکانی ہوتے ہیں۔ذہن اور مادہ اگر دو مختلف اور متضاد اصول ہیں تو ان کا باہمد گر اتصال و تعامل کیونکر ہوتا ہے؟

ذہن و مادی کی ثنویت نے فلسفہ کی دو بڑی بحثوں یعنی وجودیات (Ontology)اور علمیات (Epistemology) کو جنم دیا۔وجودیات اس سوال سے بحث کرتی ہے کہ خارجی مظاہر کی نوعیت و ماہیت کیا ہے اور علمیات کا بنیادی سوال یہ ہے کہ ہم علم کیسے حاصل کرتے ہیں: آیا عقل ذریعہ علم ہے یا حواس خمسہ کی اطلاعات؟ کیا عقل و حواس سے ماورا بھی کوئی ذریعہ علم ہے جسے ہم وجدان و الہام سے موسوم کر سکتے ہیں؟ ان بحثوں سے عقلیت پسندی، تجربیت پسندی، وجدانیت اور تشکیک جیسے مکاتب فکر پیدا ہوئے۔غرض علم و آگہی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسان کی اپنے شناسا ماحول سے دوری اور مغائرت بھی بڑھتی گئی۔فلسفی کی کائنات ایک علمی آدمی کی کائنات سے یکسر مختلف ہوگئی۔تاروں بھرے آسمان اور طلوع آفتاب کا دلکش منظر اس کے لیے کوئی اور مفہوم اختیار کر گیا۔اس کے پیمانہ ہائے زمان و مکان بدل گئے۔اس نے ٹھوس مادی حقائق کے فہم و ادراک کے لیے اپنی موضوعی نفسی کیفیات کو لازمی شرائط سمجھنا شروع کر دیا۔

فلسفی چونکہ ظاہر کے پس پردہ پنہاں اصل حقائق تک رسائی چاہتا ہے اس لیے اس کے سوچنے کا رنگ ڈھنگ عملی آدمی کے طرز فکر سے بہت مختلف ہو جاتا ہے۔چنانچہ تفہیم فلسفہ کے لیے مخصوص ذہنی تربیت کی ضرورت ہے جو کہ کسی شخص میں تجریدی طرز فکر اور منطقی استدلال کی اہلیت پیدا کر سکے۔ایسی ذہنی تربیت کے لیے رسل کی ''مسائل فلسفہ''

MashalBooks.org

نہایت مفید کتاب ہے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ رسل قاری کو بتدریج فلسفیانہ تفکر کی گہرائیوں میں لے جاتا ہے اور اس مقصد کے لیے روزمرہ کی زندگی سے عمدہ مثالیں دیتا ہے۔ امثلہ سے دقیق فلسفیانہ مسائل کی توضیح وتشریح اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ کتاب کی زبان سادہ اور غیر تکنیکی ہے۔ اس میں مصنف کی یہ شعوری کوشش نظر آتی ہے کہ ایک مبتدی کو بتدریج اور دلچسپ انداز میں فلسفیانہ باریکیوں سے روشناس کرایا جائے۔

رسل چونکہ خود ''تحلیلی حقیقت'' (Analytical Realism) کا حامی تھا اسی لیے اس کتاب کا عمومی رجحان تجزیاتی ہے۔ بعض جگہوں پر تو تجزیہ وتحلیل میں اتنی شدت آ جاتی ہے کہ ساری بحث بال کی کھال اتارنے کے مترادف ہو جاتی ہے۔

اگرچہ بقول رسل زیرنظر کتاب ''مسائل فلسفہ'' کا انتہائی مختصر اور غیر مکمل جائزہ ہے، تاہم اس میں فلسفے کی وہ تمام بڑی بڑی بحثیں سمو دی گئی ہیں جن سے فلاسفہ بالعموم تعرض کرتے ہیں۔ اس میں مادیت، تصوریت، استقرا، کلیات، وجدان، حق و باطل، احتمالیت، علمیات وغیرہ کے بارے میں اختصار لیکن جامع انداز سے بحث کی گئی ہے۔ چنانچہ یہ کتاب جہاں ایک مبتدی کو فلسفہ کی نوعیت و ماہیت سے آگہی بخشتی ہے، وہیں اسے اس قابل بھی بنا دیتی ہے کہ وہ فلسفہ کی دیگر کتاب کا سہولت سے مطالعہ کر سکے۔

کتاب کا آخری باب ''فلسفہ کی اہمیت'' خصوصی طور پر اہم ہے۔ اس میں رسل ہمیں یہ بتاتا ہے کہ فلسفے کا مطالعہ کیوں ضروری ہے۔ وہ فلسفے کو ایک ایسا علم قرار دیتا ہے جو مختلف سائنسوں کی وحدت اور ارتباط کے لیے ضروری ہے۔ فلسفہ اگرچہ سائنس کی طرح حتمی اور قطعی نتائج مہیا نہیں کرتا وہ ایسے سوالات ضرور اٹھاتا ہے جو حصول علم کے نت نئے امکانات روشن کر دیتے ہیں۔ اس طرح فلسفہ کی افادیت ہی اس میں مضمر ہے کہ یہ حتمی اور یقینی نتائج کی طرف راہنمائی نہیں کرتا۔ فلسفہ کا جو شعبہ حتمی اور یقینی نتائج پیدا کرنے کا اہل بن جاتا ہے وہ اس سے کٹ کر سائنس کی حدود میں آ جاتا ہے۔ فلکیات اور نفسیات فلسفہ کی ہی شاخیں تھیں۔ لیکن نتائج کی حتمیت اور قطعیت انہیں فلسفہ سے علیحدہ کر کے سائنس کی حدود میں لے گئیں۔

MashalBooks.org

عملی زندگی میں سائنس کی اہمیت و افادیت ہر طرح سے مسلم ہے۔ لیکن سائنس فی نفسہ قدر (value) سے عاری ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے اقدار کا عرفان اور ان سے وابستگی بہت ضروری ہے۔ وہ عملی افراد جو ٹھوس مادی حقائق اور سائنس کی افادیت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اس حقیقت سے غافل ہیں کہ انسانی شخصیت کا ایک ارفع و اعلیٰ پہلو روحانی اور ذہنی زندگی کا بھی ہے۔ فلسفہ اگرچہ سائنس کی طرح عوام الناس کی زندگیوں پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتا وہ انسان کی ذہنی و روحانی بالیدگی کا سامان ضرور مہیا کرتا ہے۔ فلسفیانہ تفکر انسانی شخصیت کو قلب ونظر کی رفعتوں سے روشناس کراتا ہے اور اعلیٰ انسانی اقدار کا عرفان بخشتا ہے۔ حکمت و دانائی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو مقاصد حیات کا علم ہو جائے۔ سائنس فی نفسہ نہ اچھی ہے نہ بری۔ اگر یہ انسانی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کی جائے تو اس کا کردار قابل تعریف ہے لیکن اگر اسے انسانوں کی ہلاکت و بربادی کا ذریعہ بنایا جائے تو یہ قابل مذمت ہے۔ لیکن اسے قابل تعریف یا قابل مذمت بنانے والے ہیں تو انسان ہی جن کی اکثریت جبلات وتعصّبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ انسان کی کوتاہ بینی، جبلی غلامی اور تنگ نظری نے ہی سائنس کے کردار کو انتہائی گھناؤنا اور بھیانک بنا دیا ہے۔ اس لیے آج کے دور میں سب سے زیادہ ضرورت فلسفیانہ تفکر کی ہے جو کہ تعصب اور تنگ نظری کی محدود فضا سے انسانی ذہن کو نکال کر آزادی اور محبت کی وسعتوں میں لائے۔ رسل لکھتا ہے:

> ''وہ ذہن جو فلسفیانہ تفکر کی آزادی اور غیر جانبداری کا عادی ہو جاتا ہے، وہ عالم جذبہ وعمل میں بھی اس آزادی اور غیر جانبداری کو قائم رکھتا ہے۔ ایسا ذہن اپنے جملہ مقاصد اور خواہشات کو کل کے اجزا کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور اس بات پر اصرار نہیں کرتا کہ یہ خواہشات اور اعمال دنیا کے نہایت چھوٹے چھوٹے اجزا ہیں جو باقی دنیا کو کسی انداز سے متاثر نہیں کرتے۔ غیر جانبداری جو تفکر کے حوالے سے سچائی کی خالص جستجو کا دوسرا نام ہے اعمال کے حوالے سے عدل و انصاف اور جذبات کے حوالے سے وہ ہمہ گیر رشتہ محبت ہے جو صرف ان افراد کے لیے مخصول نہیں جنہیں ہم کارآمد یا قابل

تعریف سمجھتے ہیں، بلکہ ہر خاص وعام سے استوار کیا جا سکتا ہے۔
چنانچہ تفکر نہ صرف ہمارے خیالات بلکہ ہمارے اعمال وجذبات کے
محمولات کو بھی وسعت اور کشادگی عطا کرتا ہے۔ یہ ہمیں ساری
کائنات کا شہری بنا دیتا ہے۔ ایک چار دیواری کے اندر محبوس کسی
مخصوص مملکت کا شہری نہیں رہنے دیتا جو دنیا کی دوسری مملکتوں سے
برسرپیکار ہو۔ انسان کی اصل آزادی اسی طرح کی آفاقی شہریت
میں مضمر ہے اور کوتاہ نظر بیم و رجا کی غلامی سے نجات بس اسی طرح
ممکن ہے۔''

زیرنظر کتاب کا ترجمہ ادارہ مشعل کے زیراہتمام شروع کیے گئے ''جدید مفکرین'' کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ترجمے کی ذمہ داری ڈاکٹر عبدالخالق چیئرمین شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب کو سونپی گئی تھی جنہوں نے اسے نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا اور رسل کے افکار کو رواں اور سلیس اردو میں پیش کیا۔ قارئین کی سہولت کے لیے آخر میں انہوں نے ایک فہرنگ اصطلاحات بھی شامل کر دی ہے جس سے اس کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔

فلسفے کے مسائل کی اشاعت اردو زبان میں ایک قابل قدر اضافہ ہے جس کے لیے میں جناب ڈاکٹر عبدالخالق اور ادارہ مشعل کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر نعیم احمد
شعبہ فلسفہ پنجاب، نیو کیمپس، لاہور
۲ جنوری ۱۹۹۵ء

پیش لفظ

آئندہ صفحات میں محض سلبی تنقید سے گریز کرتے ہوئے میں نے مباحث کو ان مسائل فلسفہ تک محدود رکھا ہے جن کے ضمن میں میرے خیال کے مطابق مثبت اور تعمیری انداز سے کچھ کہنا ممکن تھا۔ اسی بناء پر کتاب کا زیادہ تر حصہ مابعد الطبیعات کی بجائے نظریہ علم پر مشتمل ہے اور بعض عنوانات، جن کے تحت فلاسفہ نے بہت بحث و تمحیص کی ہے، اگر زیر غور لائے بھی گئے ہیں تو نہایت اختصار کے ساتھ۔

جی-ای-مور اور جے-ایم-کینس کی غیر مطبوعہ تحریریں میرے لیے بہت مددگار ثابت ہوئی ہیں ـــــــ مقدم الذکر معطیات حس اور طبیعی اشیاء کے باہمی تعلق کے ضمن میں اور موخر الذکر استقراء اور احتمال کے ضمن میں۔ پروفیسر گلبرٹ مرے کے نکات تنقید اور اس کی تجاویز سے بھی میں نے بہت استفادہ کیا ہے۔

(مصنف)

MashalBooks.org

1- ظاہر اور حقیقت

کیا دنیا میں کوئی ایسا علم ممکن ہے جو اس قدر حتمی اور یقینی ہو کہ کوئی صاحب فہم انسان اس میں شک نہ کر سکے؟ یہ سوال جو بادی النظر میں شاید آسان نظر آئے درحقیقت مشکل ترین سوالات میں سے ایک ہے۔ اگر ہمیں محض اس بات کا احساس ہو جائے کہ اس سوال کا ایک سیدھا سادہ اور باوثوق جواب تلاش کرنے میں کیا رکاوٹیں پیش آ سکتی ہیں تو سمجھ لیجئے کہ فلسفے کے مطالعے کی ہم نے ابتدا کر دی ہے۔ کیونکہ فلسفہ اسی نوعیت کے بنیادی سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ روزمرہ زندگی اور خود سائنسی فکر کے علی الرغم فلسفہ یہ کام سہل انگاری اور اذعانیت سے نہیں بلکہ سخت ناقدانہ انداز میں سرانجام دیتا ہے۔ فلسفیانہ تنقید کے اس وظیفے میں پس منظر کی حیثیت سے ان عوامل کا ادراک موجود رہتا ہے جو اس قسم کے سوالات کے اشکال کا باعث بنتے ہیں اور یہ آگہی بھی موجود ہوتی ہے کہ ان سوالات کے ضمن میں ہمارے عمومی تصورات کے اندر کس قدر ابہام اور الجھنیں پائی جاتی ہیں۔

اپنی عام زندگی میں ہم بہت سی باتوں کو یقینی قرار دیتے ہیں۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ان میں اتنے بین اور اس قدر واضح تناقضات نظر آتے ہیں کہ شدید غور و فکر کے بعد ہی سمجھ میں آتا ہے کہ ہم درحقیقت کس بات پر یقین کرنے کے مجاز ہیں۔ یہ قدرتی امر ہے کہ تلاش حق کی ابتداء حاضر اور موجود تجربات سے کی جائے۔ بلاشبہ ایک لحاظ سے علم انہی تجربات کے توسط سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن وہ علم جو بلاواسطہ طور پر ہمارے تجربات ہمیں مہیا کرتے ہیں، عین ممکن ہے صحیح نہ ہو۔ بظاہر میں اس وقت ایک کرسی پر بیٹھا ہوں۔

MashalBooks.org

ایک خاص شکل کی میز میرے سامنے ہے جس پر کچھ اوراق دکھائی دیتے ہیں جن پر قلمی یا چھپی ہوئی تحریر ہے۔ گردن گھما کے دیکھتا ہوں تو مجھے کھڑکی سے باہر عمارتیں، بادل کے ٹکڑے اور سورج دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سورج زمین سے تقریباً نو کروڑ تمیں لاکھ میل کے فاصلے پر ہے، یہ ایک آتشیں کرہ ہے جو زمین سے کئی گنا بڑا ہے، یہ کہ زمین کی دوری حرکت کی وجہ سے یہ ہر روز طلوع ہوتا ہے اور ایک غیر محدود مدت تک آئندہ بھی طلوع ہوتا رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی دوسرا نارمل انسان میرے کمرے میں آئے گا تو وہ وہی کرسیاں، میزیں، کتابیں اور کاغذات دیکھے گا جو میں دیکھ رہا ہوں اور یہ کہ جو میز میں دیکھ رہا ہوں وہی ہے جسے میں اپنے بازو کی ٹیک سے محسوس کر رہا ہوں۔ یہ سب باتیں اس قدر بدیہی نظر آتی ہیں کہ انہیں بیان کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں بجز اس کے کہ کوئی ایسا شخص مجھ سے استفسار کرے جس کو بنیادی طور پر اس بات میں بھی شک ہو کہ آیا میں کسی شے کو جان بھی سکتا ہوں یا نہیں۔ بہر حال ان تمام باتوں میں احتمال کی گنجائش موجود ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اپنے بیان کی صحت کی جانب سے پوری طرح مطمئن ہو سکیں ان تمام امور پر احتیاط کے ساتھ خاصی بحث وتمحیص کی ضرورت ہے۔

ان مشکلات کی تصریح کے لئے آیئے ایک خاص میز پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ دیکھنے میں یہ مستطیل، بادامی رنگ کی اور چمکدار ہے۔ چھونے میں یہ ہموار، ٹھنڈی اور سخت ہے۔ جب میں اسے کھٹکھٹاتا ہوں تو اس سے لکڑی کی سی آواز آتی ہے۔ کوئی بھی دوسرا شخص جو اس میز کو دیکھے گا، چھوئے گا اور اس کی آواز سنے گا، ان بیانات سے اتفاق کرے گا۔ چنانچہ لگتا ہے کہ اس معاملے میں اشکال کا کوئی پہلو موجود نہیں ہے۔ لیکن جونہی ہم قدرے زیادہ باریک بینی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں ہماری مشکلات کا آغاز ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پوری کی پوری میز حقیقتاً ایک ہی رنگ کی ہے لیکن اس کے وہ حصے جن پر روشنی پڑتی ہے دوسرے حصوں کی نسبت زیادہ اجلے نظر آتے ہیں اور بعض تو روشنی کے انعکاس کی وجہ سے سفید معلوم ہونے لگتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اگر میں میز کے پاس حرکت کروں گا تو وہ حصے جو روشنی کو منعکس کر رہے ہیں ہیئت کے اعتبار سے مختلف ہو جائیں گے اور یوں بحیثیت مجموعی میز کے نظر آنے والے تمام رنگوں کی تقسیم و ترتیب بدل جائے گی۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اگر ایک ہی لمحے میں کئی آدمی میز کو دیکھ رہے

ہوں تو ان میں سے کوئی بھی دو آدمی رنگوں کی بالکل ایک ہی طرح کی ترتیب نہیں دیکھ سکیں گے کیونکہ کوئی بھی دو آدمی ٹھیک ایک ہی زاویہ نگاہ سے میز کو نہیں دیکھ سکتے اور زاویہ نگاہ میں کسی بھی قسم کی تبدیلی روشنی کے انداز انعکاس میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پیدا کردے گی۔ عملی مقاصد کے لئے تو ایسے فرق بالعموم کوئی اہمیت نہیں رکھتے لیکن مثال کے طور پر ایک مصور کے لئے تمام تر اہمیت اسی پہلو کو حاصل ہے۔ مصور کو یہ عادت ترک کرنا پڑتی ہے کہ چیزوں کے وہ رنگ دکھائے جائیں جو فہم عامہ کے مطابق ان کے اصل رنگ ہیں اور چیزوں کے ان رنگوں کو دکھانے کی عادت اپنانا پڑتی ہے جن میں وہ دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں ان اختلافات میں سے ایک اختلاف کی بحث کا آغاز ہوتا ہے جو فلسفے میں بہت سی مشکلات کا باعث رہے ہیں یعنی ظاہر اور حقیقت میں اختلاف۔ چیزیں ظاہر کیونکر ہوتی ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ مصور یہ جاننا چاہتا ہے کہ چیزیں ظاہر کس طرح ہوتی ہیں۔ ایک عملی رجحان رکھنے والا آدمی اور ایک فلسفی یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان کی اصل کیا ہے، لیکن ایک فلسفی کی خواہش عملی آدمی کی خواہش سے زیادہ شدید ہوتی ہے اور اس سوال کا جواب دینے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ ان سے زیادہ مضطرب بھی ہوتا ہے۔

پھر سے میز کی مثال لیجئے۔ ہم اوپر جس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں اس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ کوئی رنگ ایسا نظر نہیں آتا جس کے بارے میں صاف طور پر کہہ سکیں کہ بس یہی اس میز یا اس کے کسی حصے کا رنگ ہے کیونکہ میز اگر ایک جانب سے ایک قسم کے رنگوں کی دکھائی دیتی ہے تو دوسری جانب سے دوسرے رنگوں کی اور اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان میں سے بعض رنگوں کو دوسرے رنگوں کے مقابلے میں زیادہ حقیقی شمار کیا جائے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی زاویہ نگاہ سے بھی میز کا رنگ مصنوعی روشنی مں ی اک طرح کا، رنگندھے پن کے مریض(Colour Blind) کے لئے کسی اور طرح کا، اور نیلا چشمہ پہننے والے کے لئے ان سے بھی مختلف نظر آئے گا جبکہ تاریکی میں کوئی رنگ سرے سے نظر ہی نہیں آئے گا درآنحالیکہ جہاں تک چھونے اور سننے کا تعلق ہے میز کا ادراک مستقل رہے گا۔ چنانچہ رنگ کوئی ایسی صفت نہیں ہے جو میز کے اندر موجود ہے بلکہ ایک ایسی صفت ہے جو میز، اس کے دیکھنے والے اور میز پر پڑنے والی روشنی کے انداز، سب پر منحصر ہے۔ جب روزمرہ کی زندگی میں ہم میز کے رنگ کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد اس رنگ سے ہوتی

MashalBooks.org

ہے جو ایک صحیح النظر دیکھنے والے کے لئے ایک معمول کے نقطۂ نظر سے اور روشنی کی عام کیفیات کے تحت ظاہر ہو گا۔ مگر دوسرے رنگ جو مختلف کیفیات کے دوران نظر آتے ہیں اس لائق ہیں کہ انہیں بھی یکساں طور پر حقیقی قرار دیئے جانے کا حقدار گردانا جائے۔ جانبداری کے الزام سے بچنے کے لئے ہم اس بات کا انکار کرنے پر مجبور ہیں کہ میز کا فی نفسہ کوئی ایک مخصوص رنگ ہے۔

یہی بات سطح کاری کے ضمن میں بھی صحیح ہے۔ ننگی آنکھ سے ہمیں لکڑی کی اندرونی دھاریاں نظر آتی ہیں لیکن ویسے میز کی سطح ہموار اور مسطح دکھائی دیتی ہے۔ اگر اسے خوردبین کی مدد سے دیکھیں تو ہمیں ناہمواری کا احساس ہو گا، گویا پہاڑیاں اور وادیاں دکھائی دینے لگیں گی اور ہر قسم کے فرق نمایاں ہو جائیں گے جو اب تک ننگی آنکھ سے پوشیدہ تھے۔ ان دونوں میں سے حقیقی میز کسے کہیں گے؟ قدرتی طور پر ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ جو میز ہم خوردبین کی مدد سے دیکھتے ہیں وہ زیادہ حقیقی ہے لیکن ایک زیادہ طاقتور خوردبین استعمال کرنے سے یہ صورت پھر بدل سکتی ہے۔ اب اگر ہمیں اس پر بھروسہ نہیں جو ہم ننگی آنکھ سے دیکھتے ہیں تو اس پر بھروسہ کیوں کریں جسے ہم ایک خوردبین کی مدد سے دیکھتے ہیں؟ یوں حواس پر ہمارا وہ اعتماد متزلزل ہونا شروع ہو جاتا ہے جس سے ہم نے اپنے استدلال کی ابتداء کی تھی۔

یہی حال میز کی شکل کا بھی ہے۔ ہماری عادت ہے کہ ہم چیزوں کی حقیقی شکل کے بارے میں حکم لگا دیتے ہیں اور یہ کام ہم اس قدر بغیر سوچے سمجھے کرتے ہیں کہ اپنی دانست میں گویا ہم واقعتاً حقیقی شکل کو دیکھ رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر شے نظر کے مختلف زاویوں سے مختلف شکل کی دکھائی دیتی ہے۔ جو شخص تصویر کشی کا فن سیکھنا چاہتا ہو اسے یہی بات ذہن نشین کرنا ہوتی ہے۔ اگر ہماری میز اصلاً مستطیل ہے۔ تو تقریباً تمام زاویہ ہائے نگاہ سے یوں محسوس ہو گا کہ اس کے دو زاویے حادہ اور دو منفرجہ ہیں۔ اگر دو متقابل اضلاع متوازی ہیں تو یوں معلوم ہو گا کہ دیکھنے والے سے دور کہیں نہ کہیں ایک نقطے پر مل جائیں گے۔ اگر ان کی لمبائی ایک جیسی ہے تو ایسا لگے گا جیسے قریب والا ضلع زیادہ لمبا ہے۔ ایک میز کو دیکھتے ہوئے یہ تمام باتیں عام طور پر نظر انداز ہو جاتی ہیں کیونکہ تجربے نے ہمیں یہ بات سکھلا دی ہے کہ ظاہری شکل ہی کی بنا پر حقیقی شکل کو تعمیر کر لیا جائے اور یہ حقیقی شکل وہ

نہیں ہے جسے ہم دیکھتے ہیں، بلکہ وہ ہے جسے ہم ظاہر سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں اس کی شکل کمرے میں ہماری ہر نقل وحرکت کے ساتھ مسلسل بدلتی رہتی ہے۔ چنانچہ شکل کے اعتبار سے بھی حواس ہمیں میز کی حقیقت کا نہیں بلکہ محض اس کی ظاہری صورت کا علم دیتے ہیں۔

جب ہم حاسہ لمس پر غور کرتے ہیں تب بھی اسی قسم کی مشکلات پیش آتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ میز چھونے پر ٹھوس پن کا احساس پیدا کرتی ہے اور یہ کہ یہ دبانے کے عمل کو روکتی ہے۔ لیکن ہمارے احساس کا دارومدار اس امر پر ہے کہ ہم اسے کتنے زور سے اور جسم کے کس حصے سے دباتے ہیں۔ چنانچہ جب یہ احساسات ہمارے جسم کے مختلف حصوں پر منحصر ہیں اور دباؤ کی شدت سے اس درجہ متعلق ہیں تو ان کے ذریعے سے میز کی کسی خاص صفت کا براہ راست معلم ہو جانا ناممکن ہے۔ البتہ ان احساسات کو زیادہ سے زیادہ میز کی کسی ایسی صفت کی علامات قرار دیا جا سکتا ہے جو ان احساسات کو پیدا تو کرتی ہے مگر فی الواقع ان میں خود رونما نہیں ہوتی۔ میز کو کھٹکھٹانے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اس پر یہ صورتحال اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ منطبق ہوتی نظر آتی ہے۔

معلوم یہ ہوا کہ حقیقی میز ...... اگر کوئی حقیقی میز ہے...... وہ نہیں ہے جس کا تجربہ دیکھنے، چھونے یا سننے سے براہ راست ہوتا ہے۔ حقیقی میز ہمارے علم میں بلا واسطہ آ ہی نہیں سکتی۔ اسے محض بلاواسطہ معلومات سے مستنبط کیا جا سکتا ہے۔ یوں یہاں دو نہایت مشکل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(الف) کیا کوئی حقیقی میز موجود ہے؟

(ب) اگر ہے تو یہ کس نوعیت کی شے ہو سکتی ہے؟

ان سوالات پر غور کرنے کے لئے چند ایسی آسان اصطلاحات کا تعین مددگار ثابت ہوگا جن کے معانی واضح اور صاف ہوں۔ آیئے ان چیزوں کے لئے معطیات حس کی اصطلاح استعمال کریں جن کا حواس کی وساطت سے براہ راست علم ہوتا ہے۔ جیسے رنگ، آواز، بو، ٹھوس پن، کھردرا پن وغیرہ۔ ''حس'' اس تجربے کا نام ہے جس کے ذریعے سے ان چیزوں کا بلا واسطہ علم ہوتا ہے یوں جب ہم کوئی رنگ دیکھتے ہیں تو ہمیں رنگ کی حس موصول ہوتی ہے۔ لیکن رنگ بجائے خود معطیہ حس ہے، حس نہیں ہے۔ رنگ وہ ہے

MashalBooks.org